THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

وارث شاہ کے قصے ہیر رانجھا میں عورت کی مزاحمت اور نسائی شعور کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of Female Resistance and Feminist Consciousness in Waris Shah's Heer Ranjha

TOOBA REHMAN
Student, Bs Urdu at International Islamic University Islamabad
Department of Urdu International Islamic University Islamabad
Email : toobawarsi707@gmail.com

Abstract

This paper presents an analytical study of female resistance and feminist consciousness in Waris Shah's Heer Ranjha within the cultural, historical, and literary context of Punjabi classical poetry. The character of Heer emerges not only as a lover but as a powerful symbol of defiance against patriarchal, tribal, and socio-religious oppression. Through her choices, voice, emotional strength, and moral autonomy, Heer challenges the structures that seek to control a woman's body, desire, and freedom. Waris Shah's poetic narrative, rich in symbolism and cultural commentary, amplifies Heer's agency and positions her as an early representation of indigenous feminist thought in South Asian literature. This study argues that Heer Ranjha is not merely a tragic romance but a profound socio-political text where a woman uses love, courage, and selfhood as tools of resistance. The analysis highlights how Heer's struggle continues to shape modern feminist discourse and remains relevant to contemporary discussions on gender, identity, and freedom.

Keywords;Waris Shah, Heer Ranjha, Female Resistance, Feminist Consciousness, Patriarchy, Gender Identity, Women's Agency, Symbolism, Socio-cultural Oppression, Punjabi Classical Literature, Indigenous Feminism, Subcontinental Literature.

یہ مقالہ وارث شاہ کے قصہ ہیر رانجھا میں عورت کی مزاحمت اور نسائی شعور کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے، جسے پنجابی کلاسیکی ادب اور ثقافتی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ ہیر کا کردار صرف ایک عشقیہ داستان کی مرکزی شخصیت نہیں بلکہ ایک ایسی باہمت اور باشعور عورت ہے جو پدرشاہی، قبائلی اور سماجی جبر کے خلاف اپنی آواز، فیصلہ سازی، جذباتی قوت اور اخلاقی آزادی کے ذریعے مزاحمت کرتی ہے۔ وارث شاہ کی شاعری، جو علامتی اور سماجی معنویت سے بھرپور ہے، ہیر کے اس نسائی شعور کو ابھارتی ہے جو جنوبی ایشیائی تہذیب میں مقامی سطح پر نسائیت کے ابتدائی نقوش پیش کرتا ہے۔ یہ مقالہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہیر رانجھا محض محبت کی داستان نہیں بلکہ ایک سیاسی و سماجی متن ہے جس میں عورت اپنی محبت، جرات اور خود آگاہی کے ذریعے ظلم کے خلاف کھڑی ہوتی ہے۔ ہیر کا یہ کردار آج کے نسائی مباحث میں بھی اسی طرح معنی خیز اور فکر انگیز ہے۔

تمہید(Introduction)

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

پنجابی ادب برصغیر کی ادبی اور ثقافتی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ صدیوں سے محبت، مزاحمت، انسانی جذبات اور اخلاقی اقدار کی عکاسی کرتی رہی ہے۔ پنجابی لوک کہانیاں اس روایت کا ایک اہم حصہ ہیں، اور انہی میں ہیر رانجھا کی کہانی اپنی لازوال اہمیت کی وجہ سے نمایاں ہے۔ یہ قصہ صرف رومانوی داستان نہیں بلکہ ایک مکمل سماجی، اخلاقی اور ثقافتی عکاسی ہے، جو اٹھارہویں صدی کے پنجاب کے پیچیدہ سماجی وسیاسی ماحول کو ظاہر کرتا ہے۔

وارث شاہ نے ہیر کے کردار کو اس انداز میں پیش کیا کہ وہ محض محبوبہ یا عشقیہ ہیروئن نہیں بلکہ ایک طاقتور سماجی علامت بھی بن جاتی ہے۔ قصے کا آغاز ہی عورت کے نام—ہیر—سے ہوتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس روایت میں عورت مرکزی کردار اور فعال آواز کی حامل ہے۔ ہیر نہ صرف اپنے دل کی بات کہتی ہے بلکہ پدرشاہی نظام، قبائلی دباؤ، زبردستی کی شادی اور سماجی پابندیوں کے خلاف کھڑی ہو کر اپنے حقوق اور شناخت کے لیے لڑتی ہے۔ اس کے انکار، احتجاج اور خودمختاری کے اقدام نسائی شعور کی واضح علامت ہیں اور اس نے پنجابی ادب میں عورت کی نمائندگی کے نئے افق کھول دیے ہیں۔

وارث شاہ کے دور کا پنجاب مختلف سماجی اور سیاسی بحرانوں کا شکار تھا۔ جنگیں، قبائلی کشمکش، اور فرقہ وارانہ تنازعات معاشرتی ڈھانچے پر گہرا اثر ڈال رہے تھے۔ ایسے ماحول میں وارث شاہ نے ہیر کو ایک مضبوط، باشعور اور خودمختار عورت کے طور پر پیش کیا، جو اپنی محبت، اپنی شناخت اور اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ وارث شاہ نے ہیر کے کردار میں صرف جذباتی اور رومانوی عناصر نہیں ڈالتے بلکہ اسے سماجی و اخلاقی سطح پر بھی مزاحم اور فعال بنایا۔

ہیر کی مزاحمت کے انداز اور زبان میں یہ خصوصیات نظر آتی ہیں: وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے، اعتراض کرتی ہے، سوالات اٹھاتی ہے اور فیصلے خود کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہیر کو پنجابی ادب میں سب سے مضبوط نسائی آواز مانا جاتا ہے۔ وارث شاہ نے اپنی شاعری میں علامت نگاری، طنز، اور سماجی تنقید کے ذریعے عورت کے حقوق اور آزادی کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ ہیر کی جدوجہد صرف اس کے ذاتی مسائل تک محدود نہیں بلکہ ایک بڑے سماجی نظام کے خلاف ایک شعوری مزاحمت کی نمائندگی کرتی ہے۔

یہ تمہید اس تحقیق کا آغاز ہے، جس میں ہیر کے کردار کو نسائی شعور اور مزاحمت کے تناظر میں تجزیاتی انداز میں پرکھا جائے گا۔ اس مطالعے کے ذریعے یہ واضح ہوگا کہ ہیر رانجھا صرف ایک رومانوی داستان نہیں بلکہ ایک طاقتور سماجی اور ادبی متن ہے، جو عورت کی آواز، خود آگاہی اور آزادی کی علامت کے طور پر آج بھی معاصر نسائی مباحث میں نہایت اہمیت رکھتا ہے۔

پنجابی زبان کی تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے اور یہ برصغیر کی ثقافتی شناخت کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ زبان بنیادی طور پر سنسکرت، پراکریت اور اپبھرمش جیسے قدیم ہندوستانی اور وسطی ایشیائی لسانی اثرات سے پروان چڑھی۔ پنجابی زبان نے اپنی ابتدا میں زبانی روایات، لوک کہانیاں اور قصے سنانے کے انداز کے ذریعے عوام کے روزمرہ کے جذبات، مسائل اور ثقافت کو محفوظ رکھا۔ ابتدائی دور میں یہ زبان زیادہ تر زبانی تھی، اور شعر و شاعری، محاورات، لوک گیت اور قصص کی صورت میں عوام میں رائج رہی۔

پنجابی ادب میں لوک روایت کا کردار انتہائی اہم ہے۔ چھوٹے قصے، دیہی کہانیاں، اور محبت و وفا کے قصے عوامی شعور کو منتقل کرنے کا ذریعہ تھے۔ ان کہانیوں میں عورت کی نمائندگی بھی ایک بنیادی عنصر تھی، اگرچہ ابتدائی دور میں عورت کی آواز اکثر محدود اور غیر فعال تھی۔ مگر یہی لوک قصے بعد کے صوفیانہ اور ادبی کاموں کے لیے بنیاد بنے۔

پنجابی ادب کے عظیم صوفی شاعروں جیسے بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، سلطان باہو نے اس زبان کو نہ صرف روحانی اور فلسفیانہ گہرائی دی بلکہ عورت کے کردار کو بھی علامتی اور فکری انداز میں پیش کیا۔

وارث شاہ کے زمانے تک پنجابی ادب میں عورت کے کردار کی صورت حال متغیر رہی۔ کچھ لوک قصوں میں عورت محض پس منظر یا قربانی دینے والا کردار تھی، جبکہ کچھ میں محدود مزاحمت یا عشق کے اظہار کی علامت کے طور پر سامنے آئی۔ مگر وارث شاہ نے اٹھارہویں صدی کے پنجاب کے پیچیدہ سماجی اور سیاسی ماحول میں اس کردار کو مکمل طور پر مرکزیت دی۔ ان کی ہیر نہ صرف محض رومانوی کردار ہے بلکہ ایک باشعور عورت کی علامت ہے، جو اپنے جذبات، فیصلے، اور حقوق کے لیے کھل کر مزاحمت کرتی ہے۔

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

وارث شاہ کی ہیر رانجھا نے پنجابی زبان میں ایک نئے ادبی اسلوب کو جنم دیا۔ اس نے زبانی روایت کو تحریری ادب میں منتقل کیا اور داستان گوئی کے انداز میں نفسیاتی، سماجی اور اخلاقی جہات شامل کیں۔ ہیر کا کردار اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ عورت کی خود آگاہی، فکری جرات، اور اخلاقی قوت کو پیش کرتا ہے۔ قصے کے آغاز میں ہی ہیر کا ذکر اس بات کا عندیہ دیتا ہے کہ یہ کہانی عورت کے نقطۂ نظر سے بیان کی جائے گی، اور یہ روایت پورے قصے میں برقرار رہتی ہے۔

پنجابی لوک رومانوی قصے، جیسے سسی پنوں، سوہنی مہیوال، مرزا صاحبہ، ہر ایک میں محبت اور قربانی کا پہلو موجود ہے، مگر وارث شاہ کی ہیر میں ایک واضح نسائی شعور اور مزاحمت کا پہلو شامل ہے، جو اسے اپنی نوعیت میں منفرد بناتا ہے۔ اس کے جذبات، احتجاج، اور فیصلے صرف ذاتی سطح پر نہیں بلکہ معاشرتی ڈھانچے اور خاندانی پابندیوں کے خلاف بھی ہیں۔ وارث شاہ نے اس کردار کے ذریعے عورت کی خود مختاری اور آزادی کی علامت کو مضبوطی سے پیش کیا، جو اس زمانے کے دیہی معاشرے میں ایک انقلابی تصور تھا۔

علاوہ ازیں، وارث شاہ نے اپنی شاعری میں علامت نگاری اور ثقافتی استعاروں کا بھرپور استعمال کیا۔ دریا، کھیت، جھوک، موسم اور دیہی ماحول نہ صرف قصے کے منظر نامے کے لیے ہیں بلکہ ہیر کے جذبات اور مزاحمت کے اظہار کا ذریعہ بھی ہیں۔ اس علامتی زبان کے ذریعے ہیر اپنی جدوجہد کو محض لفظوں تک محدود نہیں رکھتی بلکہ ہر منظر اور صورت حال میں اپنی مزاحمت کا عملی اظہار کرتی ہے۔

پنجابی زبان کی یہ تاریخی اور ادبی ترقی صرف وارث شاہ کی ہیر تک محدود نہیں بلکہ اس نے بعد کے ادبی کاموں، نسائی مطالعے اور معاشرتی شعور پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہیر رانجھا کے ذریعے وارث شاہ نے یہ دکھایا کہ پنجابی زبان کی طاقت صرف محبت اور رومانوی اظہار میں نہیں بلکہ معاشرتی تنقید، صنفی مزاحمت اور اخلاقی بیانیہ میں بھی ہے۔

وارث شاہ کا تعارف

وارث شاہ پنجاب کی دھرتی کے ایک تاریخی قصبہ جنڈیالہ شیر خان جو شیخوپورہ سے 14 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے میں پیدا ہوئے۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ علم حاصل کرنے کی غرض سے قصور کی جانب روانہ ہوئے اور حضرت مولانا غلام مرتضٰی جو اسوقت قصور میں ہی تشریف فرما تھے کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔

آپ نے بابا بُلھے شاہ کے ہمراہ اُن سے تعلیم حاصل کی۔ دنیاوی علم حاصل کر چکے تو مولوی صاحب نے اجازت دی کہ جاؤ اب باطنی علم حاصل کرو اور جہاں چاہو بیعت کرو۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بابا بلھے شاہ نے تو شاہ عنایت قادری کی بیعت کی جبکہ سید وارث شاہ نے خواجہ فریدالدین گنج شکر کے خاندان میں بیعت کی جب "ہیر رانجھا" کے قصہ کے متعلق آپکے استاد محترم غلام مرتضٰی کو علم ہوا تو انہوں نے اس واقعہ پر ناراضی کا اظہار کیا اور کہا وارث شاہ، بابا بلھے شاہ نے علم حاصل کرنے کے بعد سارنگی بجائی اور تم نے ہیر لکھ ڈالی۔ آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو مولانا نے اپنے مریدوں کو کہہ کر آپ کو ایک حجرے میں بند کروا دیا۔ دوسرے دن آپکو باہر نکلوایا اور کتاب پڑھنے کا حکم دیا جب آپ نے پڑھنا شروع کیا تو مولانا صاحب کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ سننے کے بعد فرمایا، وارثا! تم نے تو تمام جواہرات مونج کی رسی میں پرو دیے ہیں۔ یہ پہلا فقرہ ہے جو اس کتاب کی قدر و منزلت کو ظاہر کرتا ہے۔ سید وارث شاہ درحقیقت ایک درویش صوفی شاعر ہیں۔ وارث شاہ کا دور محمد شاہ رنگیلا سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک کا دور ہے۔ وارث شاہ کو پنجابی زبان کا شیکسپیئر بھی کہا جاتا ہے۔ پنجابی زبان کو آپ نے ہی عروج بخشا ہے۔ پنجابی کی تدوین و ترویج میں وارث شاہ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آپکا کلام پاکستان اور ہندوستان بالخصوص سکھوں میں بہت مقبول ہے۔ "ہیر" میں بہت سی کہاوتوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے جو لوگوں کے لیے ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہیں۔ وارث شاہ کی "ہیر" کے علاوہ دوسری تصانیف میں معراج نامہ، نصیحت نامہ، چوہریڑی نامہ اور دوہڑے شامل ہیں۔

تاریخ ادوار کے اہم مورخ رام بابو سکینہ نے لکھا ہے کہ "افسوس اردو زبان میں کوئی وارث شاہ پیدا نہیں ہوا" ڈاکٹر روش ندیم اس بات کو ایک مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق سنہ 1964 میں فیض احمد فیض نے ایک پیپر لکھا جس میں انھوں نے کہا کہ "میں دکھی ہوا کہ میں غالب جیسا شعر تو کہہ سکتا ہوں مگر وارث شاہ جیسا مصرع

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

نہیں "ڈاکٹر روش نے پنجابی اور اردو کے شاعر رانا سعید دوشی کی "ہیر دوشی: کیدو بنام وارث شاہ" کی تقریب رونمائی میں کہا تھا کہ "مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں یہ میں نے خود دیکھا کہ پنجاب میں فجر کی نماز کے بعد بزرگ تلاوتِ قرآن پاک کے بعد ہیر کی تلاوت کو بھی فرض سمجھتے تھے۔" ان کے خیال میں ہیر بولتا پنجاب ہے۔ اور اتنی مقبولیت شاید ہی کسی اور تخلیق کو حاصل ہوئی ہو۔ طارق بھٹی کے مطابق "وارث شاہ اپنے وقت سے آگے تھے۔ انھوں نے جو تہذیبی اور تخلیقی انداز میں سوالات اٹھائے ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے ہیں۔ وارث شاہ کے مصدقہ نخسے میں تقریبا 631 بند ہیں۔ جن میں فلسفہ موسیقی، سماجیات، عمرانیات، تہذیب، حکمت، کھیت، کھلیان، زیورات، عورتیں، سماجی درجہ بندی، رسمیں ریت اور رواج ملیں گے۔ وارث شاہ نے ہیر کا قصہ اٹھارویں صدی میں لکھا اور پھر یہ زبان زد عام ہو گیا۔ جسے **دیوان پنجاب** بھی کہا جاتا ہے۔ وارث شاہ سے قبل بھی لوگوں نے اس قصے کو لکھا تھا۔ سب سے پہلے اس قصے کو ہندو شاعر **دمودر** نے لکھا۔ یہ ہندو شاعر بہلول لودھی کے عہد میں پیدا ہوا اور اکبر کے عہد میں اس نے قصے کو نظمایا۔ دمودر اور وارث شای کے قصے میں خاصا فرق ہے۔ دمودر نے یہ قصہ عمر کے آخری حصے میں لکھا۔ اور ہیر اور رانجھے کو آخر میں مکہ روانہ کر دیا۔ جبکہ وارث شاہ نے یہ قصہ جوانی میں لکھا۔ اسی لیے وارث شاہ کے قصے کا عنصر نمایاں ہے۔ اور وہ آخر میں دونوں کو مروا ڈالنے کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔ دمودر بار بار کہتا ہے کہ

اکھیں ڈٹھا قصہ کیتا میں تاں گنی نہ کوئی

میں نے اپنی آنکھوں سے اس واقعے کو دیکھا ہے۔ اور پھر لکھا ہے۔

احمد گوجر: اورنگزیب کے عہد میں ہوئے۔ انھوں نے وارث سے تقریبا ستر اسی سال پہلے ہیر لکھی۔ احمد گوجر نے ہی اس قصے کا خاکہ بنایا جسے بعد میں وارث شاہ اور مقبل نے استعمال کیا۔ وارث اور احمد کی ہیر میں بہت مماثلت ہے۔ احمد نے جن کرداروں کو تخلیق کیا وارث نے بعد ازں انھیں اپنایا۔

مقبل: مقبل نے اپنا قصہ وارث شاہ سے چند برس پہلے لکھا تھا۔ مولا بخش کشتہ کے مطابق انھوں نے وارث سے بیس تیس برس پہلے لکھا تھا۔ مقبل کی ہیر وارث کی مقابلے میں چھوٹی ہے۔ وارث نے اسی قصے کو مفصل بیان کیا ہے۔ بلکہ انھیں یہ زبانی یاد تھا۔

ان کے علاوہ **شاہ حسین اور بلھے شاہ** نے ہیر رانجھے کے استعاروں کو خدا اور انسان کے روپ میں پیش کیا اور کھیڑوں کو حرص وہوس کی علامت بنایا۔ لیکن ان سب میں سے زیادہ شہرت وارث شاہ کے قصے ہیر رانجھا کو ملی۔ وارث شاہ کے کمالِ فن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے ہیر کو رانجھے سے چھین لیا۔ آج ہر کوئی اس قصہ کو ہیر رانجھا کے نام سے نہیں بلکہ وارث شاہ کی ہیر کے نام سے جانتے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو۔ وارث شاہ نے بھی تو معمولی داستان کو اپنے علم و حکمت، حسنِ بیان اور زبان کی چاشنی سے نہ صرف آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا بلکہ اس کو پنجابی ادب کا شاہ کار بنایا۔ جسے دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہی فن و حکمت ہیر کو محض محبوبہ یا داستان کی عورت کے طور پر پیش نہیں ہونے دیتی، بلکہ اسے ایک باخبر، خود مختار اور جرات مند نسائی شخصیت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ تاہم نسائی شعور صرف ہیر تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وارث شاہ نے رانجھے کی بھابھیوں، ہیر کی سہیلیوں، سیتی اور دیگر خواتین کرداروں کو بھی اس انداز سے تخلیق کیا ہے کہ وہ سوچ اور شعور سے معمور اور سماجی جبر کے خلاف مزاحمت کرتی نظر آتی ہیں۔

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

وارث شاہ کی ہیر ایک خاموش محبوبہ نہیں بلکہ ایک باغی عورت ہے۔ ہیر کو جب پتہ چلتا ہے کہ رانجھا اس کے پلنگ (جو کہ باغ میں خاص ہیر کے لیے بنوایا گیا ہے) پر سو رہا ہے۔ تو وہ اپنی ساٹھ سہیلیوں کے ساتھ ہاتھوں میں ڈنڈے لیے بلا کسی خوف و خطر رانجھے پر برس پڑتی ہے۔ یہ نسائی شعور کی زبردست مثال ہے۔ ہیر کا رانجھے سے اظہار محبت کرنا اس کی خود مختاری کا ثبوت ہے۔ ہیر جب رانجھے سے ساتھ نبھانے کا عہد کرتی ہے۔ تو کہتی ہے

مینوں بابلے دی سونہہ رانجھاوے مرے ماں جے تدھ تھی مکھ موڑاں — تیرے باجھ طعام حرام مینوں تدھ باجھ نی نین نی انگ جوڑاں

تیرے ناؤں توں جان قربان کیتی — مال جیو تیرے اتوں واریائی

پاسا جان داسیس میں لابازی تساں جتیاتے اساں ہاریائی

ہیر کا یہ والہانہ انداز عورت سے خاص ہے۔ مرد ابتدائے عشق میں بڑے جوش و خروش سے عہد و پیماں کرتے ہیں لیکن محبوبہ سے فیض یاب ہونے کے بعد سرمہری اور بے رخی کا برتاؤ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن عورت جو کچھ کہتی ہے کر دکھاتی ہے۔ اور اپنی ساری عمر اور امنگیں اپنی ساری تمنائیں پیار کی بازی پر لگا دیتی ہے۔ ہیر کے اس انداز نے پیار کرنے والی تمام عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ وفا عورت کی سرشت میں ہے۔ مرد خال خال باوفا ہوتے ہیں۔ ہیر کا یہ انداز نسائی شعور، خودی اور اخلاقی قوت کا عکس ہے۔

ہیر کا رانجھے کو چاک بنا کر باپ کے پاس لانا اور باپ کو بڑی خوشی اور فخریاں انداز سے بتانا کہ میں نے بھینسوں کے لیے چاک ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ عورت کی بہادری اور اس کی خود مختاری کی بہترین مثال ہے۔ یہ اٹھارویں صدی میں پنجاب کی عورت کی فیصلہ سازی اور فعال کردار کا اجاگر کرتا ہے۔ ہیر کا رانجھے کے لیے چوری لے کر جانا نہ صرف لے کر جانا بلکہ اپنے ہاتھ سے کھلانا عورت کی Agency or Autonomy کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ صرف عاشقانہ فعل نہیں بلکہ نسائی شعور اور خود مختاری کا عملی مظہر بھی ہے۔ یہ عمل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہیر اپنے دل اور عقل کے مطابق کام کرتی ہے۔ چاہے سماجی اصول اور خاندان کی توقعات اس کے خلاف ہی ہوں۔ کیدو کا رانجھے سے چوری لینا اور ہیر کا کیدو سے واپس چوری لینا یہ ہیر کی بے باکی اس کی بہادری کو ظاہر کرتا ہے۔ ہیر کی سہیلیوں کا کیدو کو مارنا اس کی جھونپڑی جلانا اور پھر پنچائت میں الٹا کیدو پر الزام لگانا کہ کہ یہ ہمیں چھیڑتا ہے۔ طرح طرح کی باتیں کرتا ہے۔ اور پنچائت کا لڑکیوں کی بات مان لینا یہ اٹھارویں صدی کے پنجاب میں عورت کے شعوری تدبر، اجتماعی ذہانت اور حکمت عملی کی علامت ہے۔ یہ منظر واضح کرتا ہے کہ عورت محض مظلوم یا خاموش نہیں بلکہ وہ اپنے تحفظ اور حق کے لیے حالات کے مطابق حکمت سے کام لینا جانتی ہے۔

پنچائت جیسے پدرشاہی اور مردانہ اختیار رکھنے والے ادارے کے سامنے لڑکیوں کا معصومیت کا لبادہ اوڑھ لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سماجی طاقت کے ڈھانچوں کو سمجھتی ہیں اور ان کے ساتھ رہتے ہوئے اپنا بیانیہ خود تشکیل دیتی ہیں۔ کیدو پر الزام لگانا محض الزام تراشی نہیں بلکہ ظالم کردار کو بے نقاب کرنے اور عورت کے خلاف ہونے والی سازش کو پلٹ دینے کی شعوری تدبیر ہے۔ اس پورے عمل میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ پنچایت کا لڑکیوں کی بات مان لینا۔ یہ لمحہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب عورت اجتماعی شعور، ذہانت اور اتحاد کے ساتھ بولتی ہے۔ تو سماجی اختیار کے مراکز بھی اس کی آواز کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ یہاں عورت کی Agency واضح ہوتی ہے۔ کہ وہ حالات کو اپنے حق میں موڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یوں یہ واقعہ وارث شاہ کے نسائی شعور کی گہری سمجھ کو ظاہر کرتا ہے، جہاں عورت محض انصاف کی منتظر نہیں رہتی بلکہ اپنی عقل، اتحاد اور تدبر سے انصاف حاصل کرنے کی راہیں خود تراشتی ہے۔ یہ پنجابی ادب میں عورت کی فعال شخصیت کا نہایت مضبوط اظہار ہے۔ کیدو کا ہیر کی ماں کو شکایت کرنا دراصل پدرشاہی سماج میں عورت پر نگرانی اور کنٹرول کی ایک صورت ہے۔ کیدو کی شکایت پر ماں جب ہیر کو ڈانٹتی ہے تو ہیر رانجھے سے عشق کا اعتراف کرتی ہے۔ ہیر کا اپنے عشق کا کھلے عام اعتراف نسائی شعور کی اعلیٰ مثال ہے۔ وہ خوف، شرم اور سماجی دباؤ کو رد کرتے ہوئے یہ اعلان کرتی ہے کہ اس کی محبت جرم نہیں بلکہ اس کا حق اور اس کی شناخت ہے۔ اس لمحے ہیر اپنے جذبات کو چھپانے کے بجائے اپنے وجود اور انتخاب کا دفاع کرتی ہے، جو عورت کی Agency اور اخلاقی جرات کو نمایاں کرتا ہے۔ اور پھر ہیر ماں سے کہتی ہے کہ "تلوار عورت اور عشق کو بے نقاب نہیں کرنا چاہیے" یہ محض شاعرانہ جملہ نہیں بلکہ ایک گہرا فکری احتجاج ہے۔ یہ بیان اس تصور کو رد کرتا ہے کہ عورت کی

The Study of Religion and History

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

محبت کو طاقت، تشدد یا جبر کے ذریعے قابو میں لایا جاسکتا ہے۔ ہیر یہاں یہ واضح کرتی ہے کہ عورت اور عشق دونوں نرمی، حرمت اور احترام کے متقاضی ہیں، نہ کہ تشدد اور زبردستی کے۔ یہ جملہ پدرشاہی نظام کے خلاف ایک علامتی بغاوت ہے، جو عورت کے جسم، جذبات اور فیصلوں پر زبردستی مسلط اختیار کو چیلنج کرتا ہے۔ جب ہیر کے عشق کا چرچا عام ہو جاتا ہے۔ تو والدین اور قاضی مل کر ہیر کو سمجھاتے ہیں۔ تو ہیر جواب دیتی ہے کہ

"نشے کے عادی لوگوں کو نشے سے منع کیا جاسکتا. پختہ عادت کو چھوڑنا مشکل ہوتا ہے اس لیے رانجھے چاک سے میرا دور رہنا ممکن نہیں. شیر چیتے بھلا ماس سے کیسے دور رہ سکتے ہیں. اور اگر انھیں شکار نہ ملے تو زبردستی چھین لیتے ہیں تقدیر اور اللہ کی رضا نہیں ٹل سکتی. جس طرح عام اور لوہے کا داغ نہیں جاتا اسی طرح عشق کا داغ بھی صاف نہیں ہوتا۔ آپ کا جو حکم ہو وہ ہمیں قبول ہے مگر رانجھے سے جدائی والی بات غلط ہے۔"

ہیر نشے کی مثال دے کر یہ واضح کرتی ہے کہ جیسے وقتی لت کو روکا جاسکتا ہے مگر پختہ عادت کو زبردستی نہیں چھوڑوایا جاسکتا، اسی طرح عشق بھی محض ایک جذبہ نہیں بلکہ انسان کے وجود میں رچ بس جانے والی کیفیت ہے۔ رانجھے چاک سے جدائی کو ناممکن قرار دینا دراصل عورت کے اس حق کا اعتراف ہے کہ وہ اپنے دل کے فیصلے کو وقتی دباؤ یا سماجی حکم کے تحت مسترد نہیں کرسکتی۔ یہ بیان ہیر کی خود آگاہی اور فکری خود مختاری کو نمایاں کرتا ہے۔

شیر اور چیتے کی تمثیل میں ہیر عشق کو فطری جبلّت سے جوڑتی ہے، یوں وہ سماج کے اس بیانیے کو رد کرتی ہے جو عورت کی محبت کو اخلاقی لغزش سمجھتا ہے۔ وہ واضح کرتی ہے کہ جس طرح فطرت کے اصول کو بدلا نہیں جاسکتا، اسی طرح عشق اور تقدیر بھی اللہ کی رضا کے تابع ہیں، انسانی حکم اور جبر ان پر غالب نہیں آسکتے۔ یہاں ہیر عورت کے عشق کو الٰہی تقدیر اور فطری حق کے درجے پر فائز کر دیتی ہے، جو پدرشاہی اخلاقیات کے مقابل ایک مضبوط فکری موقف ہے۔

عام اور لوہے کے داغ کی مثال دے کر ہیر یہ اعلان کرتی ہے کہ جس طرح جسم پر لگنے والا گہرا داغ مٹایا نہیں جاسکتا، اسی طرح عشق کا داغ بھی وجود سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمثیل عورت کے جذبات کو وقتی کمزوری نہیں بلکہ شناخت اور وجود کا حصہ ثابت کرتی ہے۔ تاہم ہیر کا یہ کہنا کہ "آپ کا جو حکم ہو وہ ہمیں قبول ہے" اس کی بغاوت کو بدتمیزی یا سرکشی نہیں بننے دیتا؛ بلکہ وہ وقار، شائستگی اور فکری پختگی کے ساتھ اپنی حد مقرر کرتی ہے کہ اطاعت کی بھی ایک سرحد ہے، اور وہ سرحد رانجھے سے جدائی ہے۔

یوں یہ مکالمہ ہیر کو ایک ایسی نسائی شخصیت کے طور پر پیش کرتا ہے جو خاموش فرمانبرداری کے بجائے شعوری مزاحمت کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ وہ تلوار نہیں اٹھاتی مگر الفاظ، تمثیل اور دلیل کے ذریعے سماجی جبر کو چیلنج کرتی ہے۔ وارث شاہ اس منظر کے ذریعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عورت کی اصل بغاوت شور میں نہیں بلکہ سچ، استقامت اور اپنے حقِ محبت کے اقرار میں ہوتی ہے، اور یہی نسائی شعور کی بلند ترین صورت ہے۔

ہیر کا جواب سن کر ماں باپ اس کو قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہیں تو ہیر کہتی ہے "اے باپ جنھوں نے بیٹیوں کو قتل کیا وہ روز قیامت گناہوں کے بوجھ تلے دبے ہوں گے. یوں سمجھیں جن بیٹیوں کو انہوں نے قتل کیا تھا انہی کا گوشت ان کو کھانے کو ملے گا. والدین کی ہر بات ہم قبول کرنے کو تیار ہیں. اگر نہ مانیں تو ہمارے گلے میں کپڑا اٹھونسو اور منہ میں گھاس. ہاں مگر رانجھے چاک کی بات ہم سے نہ کی جائے" جب ہیر کے ماں باپ اسے قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہیں تو یہ لمحہ پدرشاہی سماج کے اس انتہائی رویّے کو بے نقاب کرتا ہے جہاں عورت کے عشق اور انتخاب کو عزت کے نام پر مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر اسی لمحے ہیر کا ردِ عمل اسے ایک مظلوم بیٹی کے بجائے باشعور، باوقار اور مزاحم نسائی وجود میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ہیر کا یہ کہنا کہ "اے باپ! جنھوں نے بیٹیوں کو قتل کیا، وہ روزِ قیامت گناہوں کے بوجھ تلے دبے ہوں گے" محض جذباتی جملہ نہیں بلکہ اخلاقی اور دینی استدلال ہے۔ وہ باپ کے اختیار کو اسی کے مذہبی اور اخلاقی پیمانوں پر پرکھتی ہے اور یوں پدرشاہی تشدد کو دین اور عدل کے نام پر چیلنج کرتی ہے۔ بیٹیوں کے قتل کو قیامت کے عذاب اور گوشت کھلائے جانے کی تمثیل سے جوڑ کر ہیر اس عمل کو نہ صرف غیر انسانی بلکہ اخلاقی جرمِ عظیم قرار دیتی ہے۔

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

اس کے بعد ہیر کا یہ کہنا کہ "والدین کی ہر بات ہم ماننے کو تیار ہیں، اگر نہ مانیں تو ہمارے گلے میں کپڑا اٹھونسو اور منہ میں گھاس" اس کے صبر، وقار اور اطاعت کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے، مگر اسی جملے کے ساتھ وہ ایک واضح حد بھی قائم کر دیتی ہے۔ وہ اعلان کرتی ہے کہ اطاعت وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں وجود، محبت اور شناخت کا سوال شروع ہوتا ہے۔ رانجھے چاک سے جدائی کو وہ ناقابلِ قبول قرار دے کر یہ واضح کرتی ہے کہ ہیر اور رانجھا کا رشتہ محض وقتی کشش نہیں بلکہ "چولی دامن کا ساتھ" ہے، یعنی وجودی اور روحانی وابستگی۔

یہاں ہیر کی مزاحمت نہ چیخ میں ہے، نہ تلوار میں، بلکہ دلیل، اخلاق اور خود آگاہی میں ہے۔ وہ موت کی دھمکی کے سامنے بھی اپنے عشق سے انکار نہیں کرتی، یوں عورت کے اس حق کو تسلیم کرواتی ہے کہ وہ زندگی کی قیمت پر بھی اپنے شعوری انتخاب سے دستبردار نہیں ہوتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نسائی شعور جذبات سے بلند ہو کر اخلاقی جرات اور فکری استقامت میں ڈھل جاتا ہے۔

ماں باپ کے بعد ہیر کا بھائی بھی ہیر کو جان سے مارنے کید ھمکی دیتا ہے لیکن ہیر کہتی ہے

"اے بھائی جب دل آجائے تو پھر محبوب سے دور رہنا مشکل ہو جاتا ہے میں تجھ ہر قربان دریا جب کسی جگہ سے راستہ بنالے تو پھر اس کو وہاں سے موڑنا مشکل ہے خواہ کوئی کچھ بھی کر لے. آے بھائی جہاں تلواروں کے گھاؤ لگیں وہاں سے خون کیسے نہ نکلے اور اگر کسی و دات ل جائے تو سبھی حکیموں کا کہنا ہے کہ ان کو دوا بند کرنی کی کوشش نہ کی جاے یاری لگانا کوئی آسان کام نہیں اسی لیے عشق سر دیے بغیر کبھی کامیاب نہیں ہوتا"

ماں باپ کے بعد ہیر کے بھائی کی طرف سے جان سے مارنے کی دھمکی اس سماجی جبر کی انتہا ہے، جہاں مذہبی تقدّس کے پردے میں عورت کے عشق اور اختیار کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر اسی مقام پر ہیر کا جواب اسے محض مظلوم نہیں رہنے دیتا بلکہ باشعور، دلیل آشنا اور مزاحم نسائی وجود کے طور پر قائم کرتا ہے۔

ہیر کا یہ کہنا کہ "جب دل آجائے تو محبوب سے دور رہنا مشکل ہو جاتا ہے" عورت کے جذبات کو کمزوری کے بجائے وجودی حقیقت قرار دیتا ہے۔ وہ عشق کو وقتی لغزش نہیں بلکہ ایسی کیفیت سمجھتی ہے جو انسان کے پورے وجود میں سرایت کر جاتی ہے۔ دریا کی تمثیل — کہ جب دریا کسی جگہ راستہ بنالے تو اسے موڑنا ممکن نہیں — عورت کے عشق کو فطرت کے قانون کے برابر رکھ دیتی ہے، یوں وہ سماجی حکم کو فطری سچ کے مقابل لا کھڑا کرتی ہے۔ یہ محض شاعرانہ بات نہیں بلکہ فکری بغاوت ہے۔

تلواروں کے گھاؤ اور خون کی مثال دے کر ہیر یہ واضح کرتی ہے کہ جہاں جبر ہو گا وہاں اس کے اثرات ظاہر ہوں گے؛ یعنی تشدد اور دھمکی عشق کو ختم نہیں کر سکتے، بلکہ اس کی شدت کو اور نمایاں کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بیماری اور دوا کی تمثیل کے ذریعے وہ یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ جس مرض کو حکیم لاعلاج سمجھیں، وہاں دوا روکنے کی کوشش نقصان دہ ہوتی ہے — یوں ہیر عشق کو ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر پیش کرتی ہے، جسے دبایا نہیں بلکہ سمجھا جاتا ہے۔

ہیر کا یہ اعلان کہ "یاری لگانا کوئی آسان کام نہیں" اور "عشق سر دیے بغیر کامیاب نہیں ہوتا" عورت کی اخلاقی جرات اور شعوری قبولیتِ قربانی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس راستے میں قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، مگر پھر بھی وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے ذمہ داری کے ساتھ اپنے انتخاب کا دفاع کرتی ہے۔ یہاں نسائی شعور جذباتی ضد نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اپنایا گیا موقف بن جاتا ہے۔

ماں باپ کے بعد ہیر کے بھائی کی طرف سے جان سے مارنے کی دھمکی اس سماجی جبر کی انتہا ہے، جہاں مذہبی تقدّس کے پردے میں عورت کے عشق اور اختیار کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر اسی مقام پر ہیر کا جواب اسے محض مظلوم نہیں رہنے دیتا بلکہ باشعور عورت کے تور پر سامنے لاتا ہے۔ ہیر کا یہ کہنا "جب دل آجائے تو محبوب سے دور رہنا مشکل ہو جاتا ہے "عورت کے جذبات کو کمزوری کے بجائے وجودی حقیقت قرار دیتا ہے۔ وہ عشق کو وقتی لغزش نہیں بلکہ ایسی کیفیت سمجھتی ہے جو انسان کے پورے وجود میں سرایت کر جاتی ہے۔ دریا کی تمثیل — کہ جب دریا کسی جگہ راستہ بنالے تو اسے موڑنا ممکن نہیں — عورت کے عشق کو فطرت کے قانون کے برابر رکھ دیتی ہے، یوں وہ سماجی حکم

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

کو فطری سچ کے مقابل لا کھڑا کرتی ہے۔ تلواروں کے گھاؤ اور خون کی مثال دے کر ہیر یہ واضح کرتی ہے کہ جہاں جبر ہو گا وہاں اس کے اثرات ظاہر ہوں گے؛ یعنی تشدد اور دھمکی عشق کو ختم نہیں کر سکتے، بلکہ اس کی شدت کو اور نمایاں کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بیماری اور دوا کی تمثیل کے ذریعے وہ یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ جس مرض کو حکیم لاعلاج سمجھیں، وہاں دوا روکنے کی کوشش نقصان دہ ہوتی ہے—یوں ہیر عشق کو ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر پیش کرتی ہے، جسے دبایا نہیں بلکہ سمجھا جاتا ہے۔

ہیر کا یہ اعلان کہ "یاری لگانا کوئی آسان کام نہیں" اور "عشق سر دیے بغیر کامیاب نہیں ہوتا" عورت کی اخلاقی جرات اور شعوری قبولیتِ قربانی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس راستے میں قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، مگر پھر بھی وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے ذمہ داری کے ساتھ اپنے انتخاب کا دفاع کرتی ہے۔ یہاں نسائی شعور جذباتی ضد نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اپنایا گیا موقف بن جاتا ہے

اس کے بعد ہیر کے ماں باپ ہیر کا رشتہ سیدے کھیڑے سے طے کر دہتے ہیں اس پر بھی ہیر شور مچاتی ہے اور کہتی ہے کہ ماں یہ تو بے عقلوں کا کام ہے کہ محل کی اینٹ کو کسی اور جگہ پر لگا دیتے ہیں تم لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے کہ کونج کا رشتہ ایک چغدے کے ساتھ کر دیا ہے یا یوں جانو کہ ایک پری کو کسی ڈنگر کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو. ہیر رانجھے کو جا کر کہتی ہے آؤ ہم بھاگ جاتے ہیں لیکن رانجھا کہتا ہے یہ اچھا کام نہیں اور پھر وہ بھی ہیر کو کہتا ہے تم نے اپنا مطلب نکال لیا یعنی مجھ سے بھینسیں چرا لی یہاں رانجھا ہیر کو کہتا ہے تم نے بے وفائی کی۔

جب ہیر کے ماں باپ اس کی مرضی کے برخلاف اس کا رشتہ سیدے کھیڑے سے طے کر دیتے ہیں تو یہ فیصلہ پدرشاہی سماج کے اس جبر کی علامت بن جاتا ہے جہاں عورت کو انسان نہیں بلکہ تبادلے کی شے سمجھا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہیر کا شور مچانا محض جذباتی ردِ عمل نہیں بلکہ اپنے حقِ انتخاب کے لیے بلند کی گئی شعوری آواز ہے۔ وہ اس فیصلے کو "بے **عقلوں کا کام**" کہہ کر اس سماجی منطق کو چیلنج کرتی ہے جو رشتوں کو دل، ہم آہنگی اور وقار کے بجائے حسب نسب اور مادی مفاد پر استوار کرتی ہے۔

محل کی اینٹ کو غلط جگہ لگانے، کونج کو چغد کے ساتھ باندھنے اور پری کو ڈنگر کے حوالے کرنے کی تمثیلات کے ذریعے ہیر یہ واضح کرتی ہے کہ غلط رشتہ محض ایک عورت کی زندگی نہیں بلکہ پورے وجود کی توہین ہے۔ یہ تشبیہات عورت کے حسن، ذہانت اور روحانی وقار کے اس شعور کو ظاہر کرتی ہیں جو خود اپنی قدر پہچانتا ہے۔

ہیر کا رانجھے کے پاس جانا اور یہ کہنا کہ "**آؤ ہم بھاگ جاتے ہیں**" عورت کی عملی مزاحمت کا اظہار ہے۔ یہ محض رومانوی فرار نہیں بلکہ اس سماجی قید سے نکلنے کی کوشش ہے جو اس کی مرضی، شناخت اور مستقبل پر زبردستی مسلط کی جا رہی ہے۔ یہاں ہیر ایک بار پھر فیصلہ کرنے والی، راستہ تجویز کرنے والی اور خطرہ مول لینے والی عورت کے طور پر سامنے آتی ہے—یعنی Agency اور Autonomy کی مکمل علامت۔

مگر اس مقام پر رانجھے کا انکار—یہ کہنا کہ یہ اچھا کام نہیں—اور پھر ہیر پر یہ الزام رکھنا کہ اس نے اپنا مطلب نکال لیا، نسائی شعور کے ایک تلخ مگر حقیقت پسندانہ پہلو کو آشکار کرتا ہے۔ یہ لمحہ دکھاتا ہے کہ عورت کی مزاحمت اکثر تنہا ہوتی ہے؛ جس عشق کے لیے وہ سماج، خاندان اور جان تک قربان کرنے کو تیار ہے، اسی عشق میں مرد احتیاط، خوف اور مصلحت کا سہارا لے لیتا ہے۔ رانجھے کا یہ رویّہ ہیر کی مزاحمت کو کمزور نہیں بلکہ مزید نمایاں کر دیتا ہے، کیونکہ یہاں عورت سماج ہی نہیں بلکہ محبوب کی بے عملی کے مقابل بھی ڈٹی رہتی ہے۔

جب قاضی نکاح کے لیے ہیر کے پاس آتا ہے تو ہیر کا خاموش ہو جانا کمزوری نہیں بلکہ شعوری وقار اور فکری تیاری کی علامت ہے۔ یہ وہ خاموشی ہے جو جواب سے پہلے اپنی قوت جمع کرتی ہے۔ قاضی شریعت، جنت و دوزخ اور جسمانی سزا (درّے) کی دھمکی دے کر مذہبی اختیار کو جبر کے آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے، جہاں عورت کے دل، مرضی اور وعدے کو گناہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس مقام پر قانون اخلاق سے جدا ہو جاتا ہے اور مذہب انسانیت کے بجائے طاقت کی زبان بولنے لگتا ہے۔

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

ہیر کا جواب اس پورے ڈھانچے کو فکری سطح پر چیلنج کرتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کا اور رانجھے کا نکاح روزِ الست میں ہو چکا تھا—یہ بیان محض صوفیانہ تمثیل نہیں بلکہ عورت کے عشق کو الٰہی ارادے اور تقدیر سے جوڑنے کی جرات مندانہ کوشش ہے۔ ہیر عشق کو وقتی خواہش نہیں بلکہ ازل سے طے شدہ سچ قرار دیتی ہے، اور یوں قاضی کے ظاہری قانون کے مقابل ایک باطنی، اخلاقی اور روحانی قانون پیش کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ذکر اور غوث و قطب کو وکیل کہنا اس امر کی علامت ہے کہ ہیر مذہب سے انکار نہیں کرتی بلکہ مذہب کی روح کو قاضی کی تنگ تعبیر کے مقابل رکھتی ہے۔

قاضی کا یہ کہنا کہ **"گنہگار خدا کا چور ہوتا ہے"** اور **"ماں باپ کا حکم ماننا بہتر ہے"** دراصل اطاعت کو انصاف پر فوقیت دینے کا اعلان ہے۔ اس کے جواب میں ہیر والدین کے وعدے اور اپنے قولِ قرار کا حوالہ دیتی ہے—یہ عورت کی اخلاقی خود مختاری (moral autonomy) کا اظہار ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ وعدہ، قول اور رضامندی محض رسم نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری ہیں، اور انہیں پامال کرنا حقیقی گناہ ہے۔

وارث شاہ کا یہ کہنا کہ **"کم عقلوں کو کیا خبر کہ شیر کی خوراک گدھے کے سامنے نہیں رکھی جاتی"** ہیر کے موقف کی ادبی توثیق ہے۔ یہ مصرعہ واضح کرتا ہے کہ اعلیٰ انسانی قدریں سطحی قوانین اور جاہلانہ فیصلوں کے حوالے نہیں کی جاسکتیں۔ یہاں شاعر ہیر کے ساتھ کھڑا ہو کر قاضی کے قانون پر اخلاقی فیصلہ صادر کرتا ہے۔

آخرکار قاضی ہیر کا زبردستی نکاح پڑھا دیتا ہے۔ قاضی کا زبردستی نکاح پڑھا دینا اس حقیقت کا اعلان ہے کہ قانون دلیل سے نہیں، طاقت سے نافذ ہوا۔ اگر قانون حق پر ہوتا تو جبر کی ضرورت نہ پڑتی۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں ہیر کی محبت اگرچہ ظاہری طور پر ہارتی دکھائی دیتی ہے۔ درحقیقت اخلاقی، فکری اور نسائی سطح پر جیت جاتی ہے۔ قانون کامیاب نہیں ہوتا؛ وہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔

شادی کے چند دن بعد جب ایک نئی نویلی دلہن اپنے سسرال (یعنی سالوں کے ہاں) جانے کے لیے روانہ ہوتی ہے اور ہیر سے کہتی ہے کہ اگر وہ کوئی پیغام بھیجنا چاہے تو بتا دے، تو یہ لمحہ محض اتفاق نہیں بلکہ عورتوں کے درمیان غیر تحریری اعتماد اور نسائی رفاقت کی علامت بن جاتا ہے۔ ایک ایسے سماج میں جہاں عورت کی زبان، نقل و حرکت اور اظہار پر سخت پہرے ہوں، وہاں ایک عورت کا دوسری عورت پر بھروسا کرنا خود خاموش بغاوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ہیر کا رانجھے کے نام خط بھیجنا اس کے نسائی شعور کا نہایت باوقار اظہار ہے۔ وہ براہِ راست سماج سے ٹکرانے کے بجائے عقل، حکمت اور عورتوں کے رشتوں کو مزاحمت کا ذریعہ بناتی ہے۔ یہاں عورت محض پیغام رساں نہیں بلکہ عورت کی آواز کی امین بن جاتی ہے۔ ہیر کا اس دلہن پر اعتماد اس بات کا ثبوت ہے کہ نسائی شعور صرف فرد کی مزاحمت نہیں بلکہ عورتوں کے باہمی اتحاد اور خاموش اشتراک سے بھی جنم لیتا ہے۔ یہ خط محض عشق کا اظہار نہیں بلکہ وجودی رابطے کی کوشش ہے۔ ہیر جسمانی طور پر قید ہے، مگر اس کی آواز قید نہیں ہوتی۔ وہ سماجی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنی محبت، شناخت اور تعلق کو زندہ رکھتی ہے۔ یہ عورت کی وہ مزاحمت ہے جو شور نہیں مچاتی مگر نظام کی دراڑوں سے راستہ بنا لیتی ہے۔

مزید یہ کہ نئی دلہن کا ہیر کے پیغام کو قبول کرنا اس بات کی علامت ہے کہ عورتیں ایک دوسرے کے درد، عشق اور خاموش جدوجہد کو سمجھتی ہیں۔ یہ نسائی ہمدردی اور اعتماد مردانہ سماج کے بنائے ہوئے حصار کو کمزور کر دیتا ہے، کیونکہ یہاں عورت، عورت کے لیے نگہبان اور سہارا بن جاتی ہے۔ ہیر اور رانجھے کے درمیان خط و کتابت کا آغاز اس بات کی علامت ہے کہ عورت سماجی پابندیوں کے باوجود رابطہ، منصوبہ بندی اور فیصلہ سازی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ محض جذباتی گفتگو نہیں بلکہ ایک شعوری حکمتِ عملی ہے۔

ہیر کا رانجھے کو یہ مشورہ دینا کہ وہ جوگی بن کر اس کے گاؤں، یعنی سسرال، آ جائے—نسائی شعور کی واضح مثال ہے۔ یہاں عورت محض انتظار کرنے والی نہیں بلکہ راستہ دکھانے والی، تدبیر سوچنے والی اور خطرہ مول لینے کا مشورہ دینے والی بن جاتی ہے۔ وہ سماجی نظام کی کمزوریوں کو سمجھتی ہے کہ **جوگی جیسے مذہبی کردار** کو سوال سے بالاتر سمجھا جاتا ہے، اس لیے وہ اسی شناخت کو مزاحمت کا ذریعہ بناتی ہے۔ رانجھے کا جوگی بن جانا دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ عورت کی عقل، منصوبہ بندی اور بصیرت مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نسائی

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

شعور یہاں اس حد تک مضبوط نظر آتا ہے کہ مرد کردار عورت کی تجویز پر اپنی شناخت، حیثیت اور راستہ بدلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یوں عشق میں پہل، تدبیر اور قیادت عورت کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

جب رانجھا جوگی بن کر ہیر کے گھر بھیک مانگنے آتا ہے تو سب سے پہلے اس کا سامنا سہتی سے ہوتا ہے۔ یہ محض ایک اتفاقی ملاقات نہیں بلکہ وارث شاہ کی شعوری تخلیقی حکمتِ عملی ہے۔ سہتی فوراً رانجھے کو پہچان لیتی ہے اور اس کی زبان، انداز اور دعوؤں کو جانچنے لگتی ہے۔ وہ نہ صرف حاضر جواب ہے بلکہ اپنی گفتگو میں طنز، تمسخر، دھمکی اور خود اعتمادی کا بھرپور استعمال کرتی ہے۔ رانجھا جب اپنے جادو اور کرشموں کا ذکر کرتا ہے تو سہتی اس دعوے کو مسترد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ "یہ سب ہم پہلے ہی پی چکے ہیں"، یعنی عورت یہاں خود کو تجربہ کار، ہوشیار اور مرد کے فریب سے آگاہ ثابت کرتی ہے۔ یہ جملہ دراصل اس پورے پدرسری بیانیے پر ضرب ہے جس میں عورت کو سادہ اور دھوکے میں آنے والی دکھایا جاتا ہے۔

سہتی کا راجہ بھوج اور سوہنی–مہینوال کے واقعات کا حوالہ دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ صرف ذاتی تجربے کی نہیں بلکہ اجتماعی نسائی تاریخ کی نمائندہ ہے۔ رانجھے پر مختلف زاویوں سے حملہ کرنا، اس کا مذاق اڑانا اور اس کی مردانہ برتری کو زبان کے ذریعے توڑنا عورت کی وہ مزاحمت ہے جو تلوار یا بغاوت سے نہیں بلکہ عقل اور گفتگو سے وجود میں آتی ہے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جیسے ہی رانجھا سہتی اور مراد بلوچ کے عشق کا ذکر کرتا ہے، سہتی کے لہجے میں تبدیلی آتی ہے۔ یہ تبدیلی کمزوری نہیں بلکہ انسانی شعور کی علامت ہے۔ وہ فوراً اپنی ذات کے زخم کو پہچانتی ہے اور اسے ہیر کی بیماری کے پردے میں بیان کرتی ہے۔ یہاں عورت اپنے دکھ کو سماج کے سامنے عریاں کرنے کے بجائے حکمت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ ہیر کی خوشامد اور سہتی کا رانجھے کو مرشد مان لینا بھی ظاہری اطاعت نہیں بلکہ مقصد کے حصول کی ایک عملی صورت ہے۔ یہ وہ نسائی حکمتِ عملی ہے جس میں عورت وقتی طور پر جھکتی ہے تاکہ بالآخر اپنا راستہ نکال سکے۔

سہتی کا کردار صرف زبان تک محدود نہیں رہتا بلکہ عملی مزاحمت میں بھی ڈھل جاتا ہے۔ وہ ہیر اور رانجھے کی ملاقات کا بندوبست کرتی ہے، ماں سے بات کرتے ہوئے ہیر کے حسن اور جوانی کا حوالہ دے کر اسے قائل کرتی ہے، اور یوں عورت، عورت کے لیے عورت کے خلاف بنے ہوئے سماجی پہرے کو توڑتی ہے۔ یہ نسائی اتحاد کی ایک نہایت مضبوط مثال ہے۔ سہتی اپنی سہیلیوں سے مشورہ کرتی ہے، اجتماعی منصوبہ بندی کرتی ہے اور فجر کے وقت کا انتخاب اس بات کی علامت ہے کہ عورت صرف جذبات سے نہیں بلکہ وقت، موقع اور ماحول کو سمجھ کر قدم اٹھاتی ہے۔

کھیتوں میں ہیر کے پاؤں میں کانٹا چبھو کر سانپ کے کاٹنے کا ناٹک رچانا محض فریب نہیں بلکہ اس سماج کے خلاف ایک خاموش بغاوت ہے جہاں عورت کی سچائی پر یقین نہیں کیا جاتا۔ ہیر کا سہتی کے کہنے پر مکر پر اتر آنا بھی اس بات کی علامت ہے کہ عورت یہاں مظلوم نہیں بلکہ اپنے مقصد کے لیے شعوری طور پر کردار ادا کر رہی ہے۔ فقیر، وید اور ماندریوں کی ناکامی دراصل اس مردانہ علم اور اختیار کی ناکامی ہے جو عورت کے دکھ کو سمجھنے سے قاصر ہے، جبکہ سہتی فوراً حل پیش کرتی ہے کہ باغ میں ایک مہربان جوگی ہے۔ یہ لمحہ عورت کے فہم، تدبیر اور فیصلہ سازی کی قوت کو نمایاں کرتا ہے۔ کھیڑوں کا یہ فیصلہ کہ سید اکھیڑا خود جوگی کے پاس جائے دراصل عورت کی بنائی ہوئی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے۔ جوگی (رانجھا) کا ابتدا میں خاموش رہنا اور پھر یہ کہنا کہ

" فقیروں کا عورتوں کے پاس جانا اتنا ہی برا ہے جتنا سپاہی کا میدانِ جنگ سے بھاگ جانا"

درحقیقت سماج کے مردانہ اخلاقی ضابطوں کو انہی کے الفاظ میں استعمال کرنا ہے۔ رانجھا یہاں عشق کو چھپانے کے لیے مذہب اور غیرت کی زبان اختیار کرتا ہے—یہ پدرشاہی بیانیے کا الٹ استعمال ہے۔

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

سیدا کھیڑے کا یہ اقرار کہ اس نے ہیر کو "دیکھا" بھی نہیں، **یعنی حق زوجیت ادا نہیں کیا،** عورت کے اس حق کو نمایاں کرتا ہے کہ جسمانی قربت بھی صرف جبر سے نہیں بلکہ رضا سے جڑی ہے۔ ہیر کی جسمانی اور جذباتی خود مختاری یہاں خاموش مگر طاقتور انداز میں قائم رہتی ہے۔ جوگی کا سیدے کو مارنا اور رعب جھاڑنا محض ظاہری ڈراما ہے۔ یہ مردانہ طاقت کی نقل ہے جو دراصل کمزور ہے۔ سیدا کا روتے ہوئے واپس آنا اس بات کی علامت ہے کہ قانونی شوہر ہونے کے باوجود وہ بے اختیار ہے جبکہ عورت (ہیر) کی محبت اور نسائی حکمت پورے نظام کو چلا رہی ہے۔ جب سیدے کا باپ اجو جوگی کے پاس جاتا ہے۔ اور منت سماجت کرتا ہے اور جوگی کی شرط مان لیتا ہے مجھے ہیر کے ساتھ اکیلا چھوڑ دو اور ایک کنواری لڑکی کو بھیج تو یہ لمحہ نسائی شعور کی حتمی جیت بن جاتا ہے۔ یہاں سہتی کا اعتماد مرکزی ہے—وہ جانتی ہے کہ کنواری لڑکی خود وہ ہی ہو گی اور نتیجہ کیا نکلے گا۔

رات کے وقت سہتی کا ہیر کو رانجھے کے حوالے کرنا محض مدد نہیں بلکہ عورت کی عورت سے وفاداری، اعتماد اور اجتماعی مزاحمت کا اعلان ہے۔ رانجھا کا سہتی کو دعا دینا اس اعتراف کی علامت ہے کہ عشق کی اس جنگ میں اصل فاتح عورت کی حکمت ہے، مرد کا جوش نہیں۔ مراد بلوچ کا آجانا اور سہتی کا اس کے ساتھ چلے جانا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ سہتی اپنی ذات کو پس منظر میں رکھ کر بھی دوسری عورت کی آزادی کو مقدم رکھتی ہے۔ یہ قربانی کمزوری نہیں بلکہ نسائی اخلاقیات کی اعلیٰ مثال ہے۔

سہتی اور ہیر کا بھاگ جانا دراصل پدر شاہی قید سے نکلنے کی جرات ہے۔ یہ محض عشق نہیں بلکہ عورت کا اپنی قسمت پر اختیار ہے۔ مراد اور سہتی کا منزل تک پہنچ جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاں مرد اور عورت ایک دوسرے کی حکمت کو سمجھ کر چلیں وہاں کامیابی ممکن ہے۔ سہتی کی عقل، وقت شناسی اور عملی فیصلے اسے محفوظ منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

جنگل میں رانجھے کا کہنا کہ "**مجھے نیند آرہی ہے**" مرد کی وہ غفلت ہے جو پورے قصے میں بار بار سامنے آتی ہے۔ ہیر کا جواب، "**جو سو گیا وہ مارا گیا**" محض نیند نہیں بلکہ غفلت، سستی اور فیصلے میں تاخیر پر تنقید ہے۔ یہاں ہیر کی آواز دانش مند عورت کی آواز ہے جو جانتی ہے کہ پدر شاہی سماج عورت کو ایک لمحہ بھی مہلت نہیں دیتا۔ ہیر کا کہنا کہ "**نیند نے راجوں، مہاراجوں کو مار دیا**" نیند کو سیاسی، اخلاقی اور سماجی غفلت کا استعارہ بناتا ہے۔ یہ نسائی شعور کی انتہا ہے کہ عورت صرف ذاتی عشق نہیں بلکہ تاریخ، اقتدار اور زوال کو بھی سمجھتی ہے۔

جب کھیڑے پکڑ لیتے ہیں تو ہیر کا کہنا، "میں نے جوگی کو ہزار بار سمجھایا مگر یہ باز نہ آیا اس نے میری ایک نہ سنی" عورت یہ بزدلی نہیں بلکہ اپنی محبت شعور اور مزاحمت کی پختہ چال ہے۔ بادشاہ راجہ عدلی کا فیصلہ کہ ہیر رانجھے کے حوالے ہو، اس بات کا ثبوت ہے کہ جیت ہمیشہ عشق کی ہی ہوتی ہے۔ جب سیالوں کو پتہ چلتا ہے کہ ہیر رانجھے کو مل گئی ہے۔ تو سیال رانجھے سے کہتے ہیں۔ کہ جاؤ اور بارات لیکر آؤ۔ سیالوں کا رانجھے کو بارات لانے کا کہنا سماج کی ظاہری شرافت ہے۔ ظاہر میں قبولیت، باطن میں سازش۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عورت کو امید دلائی جاتی ہے اور پھر اسی امید سے مارا جاتا ہے۔ سیالوں کا ہیر کو زہر دینا اس بات کا اعلان ہے کہ جب عورت قانون، اخلاق اور محبت سے قابو میں نہ آئے تو اسے خاموشی سے ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہ قتل صرف ہیر کا نہیں بلکہ عورت کی مرضی، انتخاب اور آواز کا قتل ہے۔ رانجھے کو لکھا گیا خط، "موت برحق ہے"، سماج کا وہ جملہ ہے جو ہر ظلم کے بعد بولا جاتا ہے تاکہ قاتل بھی پاک اور مقتول بھی خاموش رہے۔

رانجھے کی چیخ اور روح کا نکل جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر زندہ رہ سکتا تھا مگر عشق کے بغیر نہیں۔ یہاں عشق دنیا سے ہجرت کر جاتا ہے۔ ہیر اور رانجھے کا ایک ساتھ مر جانا شکست نہیں بلکہ اخلاقی فتح ہے۔ وہ سماج میں ہار گئے مگر اپنے عہد، محبت اور سچ میں کامیاب رہے۔ یہ قصہ بتاتا ہے کہ عورت بغاوت کرتی ہے، حکمت آزماتی ہے اور قربانی دیتی ہے مگر پدر شاہی سماج آخر کار اسے مار دیتا ہے۔ مگر قتل ہونے والی عورت تاریخ میں زندہ رہتی ہے اور قتل کرنے والا سماج ہمیشہ ملزم رہتا ہے۔

وارث شاہ نے ہیر رانجھا میں عورت کو ایک خود مختار، شعوری، مزاحمتی اور اخلاقی شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے، جو اپنے عشق میں پختہ اور اپنے فیصلوں میں مستقل ہے، چاہے سماجی دباؤ، خاندانی پابندیاں یا پدر شاہی قوانین ہی کیوں نہ ہوں۔ ہیر کی ہر حرکت—رانجھا کو اپنے عشق کا کھلا اظہار، والدین اور قاضی کے سامنے موقف پر قائم رہنا، اور اپنی محبت کے لیے خطرات مول لینا—یہ سب نسائی شعور، اخلاقی قوت اور فکری استقلال کی علامت ہیں۔ صرف ہیر ہی نہیں، بلکہ سہتی اور اس کی سہیلیوں ہیر کی اپنی سہیلیوں جیسی

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

دیگر خواتین کردار بھی اپنی عقل، حکمت اور عملی تدبیر سے عورت کی حفاظت اور محبت کے تحفظ میں فعال نظر آتی ہیں، جیسے سہتی ہیر اور رانجھا کی ملاقات کرواتی ہے اور سہیلیوں کے ساتھ منصوبہ بندی کر کے انہیں منزل تک پہنچاتی ہے

پنجابی اور برصغیر کے کلاسیکی ادب میں عورت کا کردار محض عشق کی علامت نہیں بلکہ ایک باخبر، ثابت قدم اور مزاحمتی ہستی کے طور پر ابھرتا ہے۔ سوہنی ماہیوال میں سوہنی اپنے عشق کے لیے سماج کی قائم کردہ حدوں کو توڑتی ہے اور ہر رات دریا پار کرنا اس کی جرات، خود مختاری اور جذباتی قوت کی علامت بن جاتا ہے؛ وہ جانتی ہے کہ انجام کیا ہو سکتا ہے، مگر خوف کو اپنی محبت پر غالب نہیں آنے دیتی۔ سسی پنوں میں سسی کی مزاحمت زیادہ داخلی اور روحانی ہے؛ وہ قبیلے، خاندان اور سماجی بندھنوں سے بغاوت کر کے تنہا صحرا کا سفر اختیار کرتی ہے، جو عورت کے عزم، صبر اور استقامت کی علامت ہے۔ لیلیٰ مجنوں میں لیلیٰ اگرچہ ظاہری طور پر سماجی پابندیوں میں جکڑی نظر آتی ہے، مگر اس کا عشق فکری اور روحانی سطح پر اتنا پختہ ہے کہ وہ مجنوں کی دیوانگی کو معنی عطا کرتی ہے اور اس کی خاموشی بھی ایک بامعنی انکار بن جاتی ہے۔ ان تینوں کرداروں میں عورت عشق کی قیمت جانتی ہے مگر پھر بھی انتخاب کرتی ہے، یہی نسائی شعور کی بنیاد ہے۔ وارث شاہ ان روایات کو محض دہراتے نہیں بلکہ انہیں فکری وسعت عطا کرتے ہیں۔ ہیر کے کردار کے ذریعے وہ عورت کو صرف عاشقہ نہیں بلکہ سوچنے والی، سوال اٹھانے والی، دلیل دینے والی اور فیصلہ کرنے والی شخصیت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہیر والدین، قاضی، سماج اور روایت سب کے سامنے اپنے عشق اور حقِ انتخاب کا دفاع کرتی ہے۔ اس کی گفتگو میں استعارہ، منطق اور اخلاقی برتری موجود ہے۔ ہیر کی موت انجام نہیں بلکہ سوال ہے۔ ایک ایسا سوال جو پدر شاہی سماج سے پوچھتا ہے کہ عورت کو مار کر کیا تم سچ، محبت اور اختیار کو بھی دفنا سکتے ہو؟ پنجابی کلاسیکل ادب کی عورت چاہے سسی ہو، سوہنی ہو، لیلیٰ ہو یا ہیر ہر دور میں اعلان کرتی ہے۔ کہ عورت اگر قتل کر دے جائے تو تاریخ میں زندہ رہتی ہے، اور جو سماج اس کو مارتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی کلاسیکی ادب میں عورت کا مقام صرف محبوبہ یا جذباتی ہستی تک محدود نہیں بلکہ فکری، اخلاقی، سماجی اور عملی اعتبار سے طاقتور اور خود آگاہ شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وارث شاہ نے ہیر کے کردار کے ذریعے یہ دکھایا کہ عورت نہ صرف اپنی محبت اور تقدیر پر اختیار رکھتی ہے بلکہ دوسروں کی رہنمائی، حفاظت اور مزاحمت میں بھی فعال کردار ادا کر سکتی ہے، اور یہی اس کی تاریخی اور ادبی اہمیت ہے۔

جدید Feminist Theory کی روشنی میں دیکھا جائے تو وارث شاہ کی عورت Agency رکھتی ہے، یعنی وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی ہے، اور Autonomy رکھتی ہے، یعنی اس کا وجود مرد کے سہارے تعریف نہیں پاتا۔ Cultural Feminism کے مطابق وارث شاہ عورت کی جذباتی ذہانت، وفا اور اخلاقی قوت کو سماجی طاقت کے طور پر پیش کرتے ہیں، نہ کہ کمزوری کے طور پر۔ Indigenous Feminism کے تناظر میں یہ قصہ مقامی قبائلی نظام، مذہبی منافقت اور خاندانی جبر کے خلاف عورت کی جدوجہد کو نمایاں کرتا ہے۔ Psychoanalytic Feminism کے مطابق ہیر کا مسلسل انکار، جراتمندانہ مکالمہ اور عشق پر اصرار عورت کے لاشعوری خوف کو شعوری بغاوت میں بدل دیتا ہے۔ ان تمام نظریات کا مشترکہ نتیجہ یہ ہے کہ وارث شاہ کی عورت مظلوم نہیں بلکہ مزاحم ہے، خاموش نہیں بلکہ گویا ہے، کمزور نہیں بلکہ فکری طور پر طاقتور ہے۔

اس تحقیقی مطالعے سے یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ وارث شاہ کا قصۂ ہیر رانجھا محض ایک عشقیہ داستان نہیں بلکہ پنجابی کلاسیکی ادب میں عورت کے نسائی شعور، مزاحمت، خود مختاری اور عملی قوت کا ہمہ گیر بیانیہ ہے۔ وارث شاہ نے عورت کو نہ تو روایتی مظلوم محبوبہ کے قالب میں محدود کیا اور نہ ہی اسے صرف جذباتی وابستگی کی علامت بنایا، بلکہ ہیر کے کردار کے ذریعے ایک ایسی عورت پیش کی جو اپنے حقِ انتخاب کے لیے لڑنا جانتی ہے، حالات کے مطابق حکمت عملی اختیار کرتی ہے، عقل، تدبیر اور جرات کے ساتھ فیصلے کرتی ہے اور اپنے عشق کو کمزوری نہیں بلکہ طاقت میں بدل دیتی ہے۔ ہیر کا فعال کردار—چاہے وہ عشق کا اعلانیہ اظہار ہو، سماجی و خاندانی دباؤ کے خلاف مزاحمت ہو، یا مقصد کے حصول کے لیے مکر و فریب اور تدبیر کا استعمال—اس امر کی دلیل ہے کہ وارث شاہ عورت کو مکمل انسانی شعور اور اختیار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

یہ مطالعہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ہیر کے ساتھ ساتھ سہتی، سوہنی، سسی اور لیلیٰ جیسے کردار پنجابی کلاسیکی ادب میں عورت کی اجتماعی فکری روایت کو مضبوط کرتے ہیں، جہاں عورت اپنی تقدیر کی محض تابع نہیں بلکہ اس کی تشکیل میں فعال کردار ادا کرتی ہے۔ جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وارث شاہ کی عورت Agency اور Autonomy کی حامل ہے، جو پدرشاہی سماج، قبائلی جبر اور مذہبی منافقت کو اخلاقی، فکری اور عملی سطح پر چیلنج کرتی ہے۔ اگرچہ سماج بالآخر طاقت کے ذریعے ہیر کو خاموش کر دیتا ہے، مگر یہ خاموشی شکست نہیں بلکہ اخلاقی فتح بن جاتی ہے، کیونکہ وارث شاہ کا قلم ہیر کو تاریخ، ادب اور اجتماعی شعور میں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیتا ہے۔

بالآخر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قصۂ ہیر رانجھا پنجابی ادب میں عورت کے مقام کو محض داستانی سطح سے اٹھا کر فکری اور تہذیبی سطح پر استوار کرتا ہے۔ وارث شاہ نے عورت کو داستان کی تابع نہیں بلکہ تاریخ کی باوقار، باخبر اور مزاحم آواز بنا دیا، اور یہی پہلو اس قصے کو نہ صرف ادبی عظمت عطا کرتا ہے بلکہ اسے ہر دور میں قابلِ مطالعہ اور معنویت سے بھرپور بنا دیتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ کتاب مقاماتِ وارث شاہ (علی عباس جلالپوری) 14 جنوری 19

2۔ وارث شاہ عہد اور شاعری (عذرا وقار) قومی ادارہ برائے تاریخ و ثقافت، سینٹر آف ایکسلنس، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد

3۔ وارث شاہ جنھوں نے ہیر کو ہیرو اور کیدو کو اسٹیبلیشمنٹ بنا دیا، بی بی سی اردو

4۔ میڈیا نیوز، اخبار؛ تحریر ڈاکٹر اظہار احمد گلزار پیر سید وارث شاہ پنجاب کی ثقافت کے علمبردار